بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اشارات

چیف مارشل لا ایڈمنسٹریٹر جنرل محمد ضیاء الحق کی تازہ تقریر کے پیچھے بھی حسب سابق ایک مخلصانہ جذبہ ضرور کارفرما ہے، مگر مسائل اتنے پیچیدہ ہیں اور مختلف مشوروں کی بوچھاڑ ان پر ہر چہار جانب سے اتنی زیادہ ہوتی ہے کہ تازہ تقریر میں فکر کے کئی خطوط ایک دوسرے کو کاٹتے ہوئے بھی دکھائی دیتے ہیں۔

مثلاً اُن کا ایک ارشاد یہ ہے کہ:

"اسلامی زندگی کا آئین جو ۱۴ سو سال پہلے نافذ ہوا تھا، آج بھی نافذ ہے۔ اسے کسی نے منسوخ نہیں کیا۔ نہ ہی کسی ایک فرد یا گروہ کے ہاتھوں دوبارہ نافذ ہونے کا محتاج ہے۔"

"اگر یہ نظام منسوخ ہو چکا ہوتا تو نماز، روزہ، حج، زکوٰۃ کے فرائض منسوخ ہو چکے ہوتے۔"

اس معنی میں تو اسلام برصغیر میں انگریزی حکومت کے سائے میں بھی نافذ تھا کہ اسلام کو یا نماز، روزہ، حج، زکوٰۃ کو کبھی منسوخ نہیں کیا گیا۔ چنانچہ قادیانیوں کے سربراہ اوّل نے انگریزی حکومت کی اطاعت اور اس سے تعاون کو شرعاً لازم قرار دیا۔ اس وقت بھی اگر اسلام کو بالفعل نافذ قرار دیا جائے تو تحریک مجددی سے لے کر تحریک خلافت تک جتنی بھی احیائے اسلام کی تحریکیں یہاں چلیں، ان سب کا مقصد و مدعا از سرِ نو طے کرنا پڑے گا۔ بلکہ خود تحریکِ پاکستان کا بھی کوئی نیا مقصد تجویز کرنا لازم ہوگا۔ کیونکہ اگر تحریکِ پاکستان کا نصب العین اسلام، اسلامی قانون اور اسلامی تہذیب کا

احیاء تھا تو پہلے سے نظامِ اسلامی کے نفاذ کا نظریہ بدلنا پڑے گا۔

کیونکہ:

"کچھ لوگ سرے سے اسے اپنی عملی زندگی سے تقریباً خارج کر چکے تھے"..... اور جو اس پر عمل پیرا ہیں وہ بھی زیادہ تر اس کی مقرر کردہ عبادتوں پہ اکتفا کرتے ہیں"۔ "اور اس کا سماجی، اقتصادی اور معاشرتی پہلو پس منظر میں چلا گیا ہے"۔

اسلام کا عملی زندگی سے خارج ہو جانا اور اس پر عمل پیرا ہونے والوں کا بھی محض چند عبادتوں پہ عمل پیرا ہونا ایک ایسا بیان ہے جس سے صاف ظاہر ہوتا ہے اسلام کا بڑا حصہ، خصوصاً سماجی اور اقتصادی امور عملاً نافذ نہیں رہے۔ اگر ایسا ہے تو پھر یہ ماننا پڑے گا کہ اسلام کا بہت بڑا حصہ ایسا ہے جسے عملاً نافذ کرنے کے لیے ایک نئی کوشش کی ضرورت ہے۔ اس نئی کوشش کی کچھ ذمہ داریاں فرد پہ بھی آتی ہیں، علماء اور مصلحین امت پر بھی آتی ہیں، اور حکومت وقت پہ بھی عاید ہوتی ہیں یہاں پہنچ کر اس جملے کا مفہوم متعین کرنا مشکل ہو جاتا ہے کہ:

"نہ ہی کسی ایک فرد یا گروہ کے ہاتھوں (اسلام) دوبارہ نافذ ہونے کا محتاج ہے"۔

یہ جملہ تو فرد اور گروہ دونوں کو سبکدوش کر دیتا ہے کہ تمہارے ذمے اسلام کے اجراء و نفاذ کے سلسلے میں کوئی بارِ فرائض نہیں ہے؟

اب شروع سے یہاں تک کے اجزائے کلام کو زیرِ غور لا کر دیکھیے کہ بات کیا بنی؟

ہمارے یہاں بہت سے لکھنے اور بولنے والوں کے طرزِ بیان سے یہ مغالطہ عام ہو گیا ہے کہ اسلام حضور خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ آیا اور نافذ ہوا۔ حالانکہ اصل حقیقت یہ ہے کہ اسلام حضرت آدم علیہ السلام کے ساتھ انسانیت تک پہنچا، آپ کے ہاتھوں سے نافذ ہوا، اور پھر جب بھی وہ عملاً زندگیوں سے خارج ہوا یا دوسرے غلط رجحانات اس میں خلط ملط ہو گئے اور عملی و دعوتی لحاظ سے اس میں تحریف ہو گئی تو پھر کسی نئے رسول و نبی نے تجدید و احیاء کا کام کیا۔ حضور خاتم النبیین کے بعد مجددینِ امت اور علماء و صلحا نے بار بار اسے تعلیمی و فکری لحاظ سے

واضح شکل میں پیش کیا اور عملاً یہ کوشش کی کہ اس کے احکام اور ادارے بحال ہو جائیں۔

اسی معنی میں ہمارے ہاں ایک اصطلاح اقامتِ دین کی رائج ہے جس کی بنیاد قرآن کے اس مطالبے پر ہے کہ " اقیموا الدین " (الشوریٰ - ۱۳) دوسری اصطلاحیں تجدید دین اور احیائے دین کی متداول ہیں جن کی بنیاد احادیث پر ہے۔ بلکہ ایک اور اصطلاح محی الدین کی بھی اسلامی لٹریچر میں شائع و ذائع ہے جو احیائے دین کے تصور پر مبنی ہے۔ ان ساری اصطلاحوں کا مطلب یہ ہے کہ دین جب کبھی انفرادی اور اجتماعی زندگیوں پر اپنا غلبہ کھو بیٹھے، دینی حقائق واضح نہ رہیں، صحیح اور غلط خیالات گڈمڈ ہو جائیں تو ہر صاحبِ ایمان و شعور فرد کا، اور ہر دینی گروہ کا اور اسلام کے لیے کام کرنے والی ہر حکومت کا یہ فرض ہو جاتا ہے کہ وہ دین کی دعوت دے، دین کے اصول و حقائق کو شکوک و اوہام اور بدعات و منکرات کے گھیروں سے نکالے، اور عملاً دین کے عقائد و عبادات، احکام و قوانین اور آداب و شعائر کو غالب کرنے کی سعی کرے۔ اسی لیے کسی کو صدی کا مجدد اور کسی کو ہزار سال کا مجدد قرار دیا جاتا ہے۔ حضرت شیخ عبد القادر جیلانی کو محی الدین کا لقب دیا گیا ہے۔ یہی الفاظ مشہور بادشاہ اورنگ زیب کے لیے بھی استعمال ہوئے۔

قرآن نے " اقیموا الدین " کے مطالبے کو دوسرے لفظوں میں بھی بیان کیا ہے، حضورؐ کی بعثت کا مقصد یہ بتایا گیا ہے کہ " لِيُظْهِرَهُ عَلَى الدِّينِ كُلِّهِ " یعنی ان کے ذمے یہ خدمت ہے کہ وہ خدا کی ہدایت یا دینِ حق کو دوسرے تمام ادیان و مسالک کے مقابلے میں عملاً غالب کر دیں۔

غلبۂ دین اور اقامتِ دین کی سعی کا یہی فریضہ امت کے ہر فرد اور مسلم معاشرہ کی ہر جماعت اور ہر حکومت پر عاید ہوتا ہے۔

ہمارے محترم جنرل محمد ضیاء الحق صاحب کو اس فریضہ سے بھی انکار نہیں ہے۔ وہ فرماتے ہیں کہ:

> " ہمیں جو ملکی قوانین ۱۹۴۷ء میں ورثے میں ملے تھے وہ ایک غیر ملکی اور غیر اسلامی حکومت کے وضع کردہ تھے ..... موجودہ قوانین کو اسلام سے ہم آہنگ کرنے کی طرف کوئی توجہ نہ دی گئی۔

پھر مثبت پہلو سے خود زور دیتے ہیں کہ:

"بنیادی طور پہ چار شعبوں میں کام کرنے کی ضرورت ہے: سماجی، اقتصادی، تعلیمی اور تعزیری"۔

لیکن پھر پلٹ کر وہ یہ فرماتے ہیں کہ:

"ان شعبوں میں خاص طور پہ سماجی شعبے میں اسلام پہ عمل کرنے کے لیے کسی قسم کے سرکاری احکامات کی ضرورت نہیں ہے۔ ضابطۂ اخلاق پہلے سے موجود ہے۔ اگر سوا سات کروڑ افراد اپنی روزمرہ زندگی میں پانچ وقت کی نماز کی عادت ڈال لیں اور عملی زندگی میں اسلامی ضابطے کو اپنا لیں تو عملی طور پہ اسلامی نظام خود بخود نافذ ہو جائے گا"

یہ بات کچھ ایسی ہی لگتی ہے جیسے کوئی ہیلتھ افیسر بیان دے کہ اگر لوگ صفائی کے پابند ہو جائیں، خراب غذائیں کھانا چھوڑ دیں، ہوا خوری اور ورزش کی عادت ڈالیں تو صحتیں خود بخود برقرار رہ جائیں گی۔

انسان کی سماجی و اخلاقی زندگی کی بڑی مشکل یہ ہے کہ یہاں خود بخود کچھ نہیں ہوتا، بلکہ اصلاح کی ہر بات کے لیے کسی نہ کسی کو اُٹھ کر اُس کے لیے آواز بلند کرنی پڑتی ہے، لوگوں کو قائل کرنا ہوتا ہے۔ پھر تربیت سے ان میں عادت پیدا کرنی ہوتی ہے۔ دوسری طرف ایسی تدابیر بھی سوچنی پڑتی ہیں کہ گھروں، تعلیم گاہوں اور پورے معاشرہ کے عمومی ماحول میں ایسے محرکات موجود نہ رہیں جو غلط سمت میں لے جانے کے لیے دباؤ ڈالتے ہوں بلکہ بالکل برعکس صورت میں ایسے عوامل پیدا کیے جائیں کہ بچوں اور بڑوں کو صحیح سمت میں بڑھنے کے لیے آسانیاں پیدا کریں۔

نظریاتی طور پہ جب مسلمانوں کے لیے شراب یا چوری کو حرام کیا گیا ہے تو شراب یا چوری کو مسلم معاشرے میں خود بخود ختم ہو جانا چاہیے، مگر ایسا عملاً تو ہوتا نہیں۔ تعمیری اصلاح کی کچھ مساعی تعلیم، ترغیب، ترہیب اور تربیت سے کی جاتی ہیں، مگر ساتھ کے ساتھ شراب اور سرقہ کا قانونی انسداد بھی کیا جاتا ہے، اور جو لوگ نہ تعلیم و تلقین کے ذرائع سے اثر قبول کریں اور نہ قانون کے خوف سے غلط حرکات سے باز رہیں، اُن کو سزا بھی دینا پڑتی ہے۔ یعنی اسلام کی اصلاحی اسکیم کا ایک سرا اگر تعلیم و تلقین ہے تو دوسرا تہدید و تعزیر۔ یہ دونوں تدابیر مل کر ہی صحیح نتیجہ پیدا کرتی ہیں۔ ایک کوشش

دوسری کے بغیر ادھوری رہ جاتی ہے اور ناقص اور کمزور نتائج دیتی ہے۔

اس مفروضے کے حق میں کوئی ایک تاریخی مثال بھی نہیں مل سکے گی کہ کسی معاشرہ کے پورے کے پورے یا بیشتر افراد نے یہ جان کر خود بخود نماز شروع کر دی ہو کہ اس کا حکم خدا نے دیا ہے۔ دعوت دینے والی قوت دیر تک کام کرتی ہے، مخالفِ نماز محرکات و موانع کو روکتی ہے۔ ترغیبی عوامل کو بڑھاتی ہے، اور کم سے کم سرکاری اداروں اور دفتروں میں اقامت صلوٰۃ کے حکم کو ضابطہ ملازمت کا جزء بنا کر افسران کو اس کے نفاذ کا ذمہ دار بناتی ہے اور اس معاملہ میں ان کی کارکردگی کے مطابق ریمارکس اُن کے فائلوں پر درج کرتی ہے۔ سرکاری ملازمتوں میں آنے اور ترقی پانے والے افراد کا ریکارڈ بسلسلہ اقامت صلوٰۃ دیکھ کر اور اہم مناصب پر آنے والوں کے حلف میں اقامتِ صلوٰۃ کے وعدے کو شامل کرا کے وہ معاشرے کو نماز کا پابند بنانے کی کوشش کرتی ہے۔

اس طرح کی بھرپور محنت کے بغیر ایک ایسے معاشرے کے کروڑوں افراد میں نماز کی ترویج کیسے ہو سکتی ہے جس میں لوگ سمجھتے ہوں کہ نماز کے بغیر بھی مسلمان اچھا خاصا مسلمان رہتا ہے اور تارکِ نماز ہوتے ہوئے بھی وہ مسلمانوں کی نمائندگی اور قیادت کر سکتا ہے اور بڑے سے بڑے عہدے پہ فائز ہو سکتا ہے۔

یہی صورتِ حال تمام دوسری خوبیوں کو پھیلانے اور خرابیوں کو مٹانے کی ہے۔

اسلامی نظام اصل میں چند متفرق اجزاء کا نام نہیں کہ فلاں کام پہلے افراد خود کر لیں اور اس کے نتیجے میں فلاں کام خود بخود ہو جائے گا، بلکہ یہ سارا ایک ہی مربوط کُل ہے۔ اسے نافذ یا غالب یا عملاً قائم کرنے کا عمل بیک وقت مختلف اطراف سے شروع کرنا ہوگا ہے۔ تعلیم کی جانب سے بھی، اقتصادیات کی اطراف سے بھی، سماجی پہلوؤں سے بھی، علمی و فکری دائرے میں بھی، نشر و ابلاغ کے ذرائع سے بھی، دفتری نظام کے واسطے سے بھی، اور دیگر تمام دوائر سے بھی۔

نظام کی تبدیلی کا کام ——— خواہ وہ کتنی ہی پُرامن اور تعمیری و فلاحی نوعیت رکھتی ہو — ایک جنگی کارروائی کی طرح سے ہوتا ہے۔ جتنی سپاہ کو اس کے لیے ترتیب دی جا سکتی ہو اسے

کمانڈر میدان میں اتارتا ہے اور ایک نقشۂ جنگ سامنے رکھ کر زور شور سے اپنی کارروائیاں انجام دیتا ہے۔ یہ گرما گرم رزمی کام اگر بزم آرائی کی شکل اختیار کرلے تو بات نہیں بنتی - یہ تو ایک نوعیت کا جہاد ہے۔

جس طرح فوجی کارروائی کے لیے اسکیم (SCHEMING) ضروری ہوتی ہے، اس طرح تیز رفتار کارروائی (QUICK ACTION) بھی لازمی ہوتا ہے۔ پھر جس طرح فوجی اقدام ہمہ جہتی (ALL ROUND) قسم کا ہوتا ہے۔ اسی طرح تبدیلیٔ نظام کا کام بھی ہمہ جہتی ہوتا ہے۔

ایسے بڑے اور جامع کام کے متعلق ہمارا یہ خیال کرنا صحیح نہیں کہ بس چند اجزا ہیں جن کو نسخے کے مطابق ایک ایک کرکے بوتل میں ڈالنا اور مکسچر تیار کرنا ہے، اور یہ تو اور بھی زیادہ پیچیدہ بات ہے کہ فلاں فلاں جزو مل جائیں (یہ بھی ایک خواہشاتی طرز فکر ہے) تو باقی مکسچر خود بخود بن جائے گا۔ اور یہ سوچنا بھی صحیح نہیں کہ فلاں فلاں اصلاحات تو لوگ کرلیں، پھر فلاں کام حکومت کرے گی۔

حقیقت میں اسلام کے لیے کام کرنے کا جذبہ رکھنے والی حکومت کو تو احیائے اسلام کی مہم کی قیادت کرنی ہوتی ہے۔ افراد سے جو کام لینے ہوتے ہیں اُن کے لیے بھی وہ محرکات فراہم کرتی ہے اور مزاحمتوں کا خاتمہ کرتی ہے۔ دوسرے لفظوں میں افراد سے ان کے رضاکارانہ جذبے کو اُبھار کر لیے جانے والے کاموں کو بھی احیائے اسلام کی پوری اسکیم میں رکھنا ہوتا ہے۔ جیسے آپ اقتصادی ترقیاتی منصوبہ میں پبلک سیکٹر اور پرائیویٹ سیکٹر کے متعلق اپنے نقشے کے مطابق حالات کی نشوونما کا انتظام کرتے ہیں۔

محترم جنرل صاحب کا یہ نکتہ بہت واضح ہے، اور یہ پچھلے بعض جملوں سے پیدا ہونے والی غلط فہمیوں کو رفع بھی کرتا ہے کہ:۔

"حکومت کے ذمے ایسے قوانین بنانا ہے جن کا تعلق افراد کی زیادہ تر اجتماعی زندگی سے ہوتا ہے"۔

فرد کی زندگی کا بہت بڑا حصّہ اجتماعی دائرے میں آتا ہے، اور بقیہ حصّہ بھی اجتماعی دائرے کے

احوال سے متاثر ہوتا ہے۔ لہٰذا اجتماعی زندگی کے لیے جو قانون سازی کی جائے گی وہ افراد کی انفرادی اور نجی زندگیوں کو بھی اپنے رنگ میں رنگتی جائے گی۔

اگر سابق قوانین کو بدلنے اور اسلام کے مطابق افراد کی اجتماعی زندگی سے متعلق اسلام کے مطابق قانون سازی کرنے کا کام حکومت کے سر عاید ہوتا ہے تو پھر یہ کیسے کہا جا سکتا ہے کہ اسلام کسی فرد یا گروہ کے ہاتھوں اپنے دوبارہ نفاذ، یا قیام یا احیاء کے لیے محتاج نہیں۔

مجھے یہ عبارات پڑھ کر خیال ہوتا ہے کہ محترم جنرل صاحب کی نیت بالکل صاف ہے، البتہ جو بات وہ کہنا چاہتے تھے اس کو ترتیب دینے میں کہیں کوئی جھول رہ گیا ہے۔

ایک یہ بات میری سمجھ میں نہیں آئی کہ:۔

"ایسے قوانین مرتب کرنے ہیں جو مسلمانوں کے تمام فرقوں کے لیے قابلِ قبول ہوں"۔

یہ مسئلہ ان مسائل میں سے ہے جن پر اسلامی قانون کے اجراء کے داعیان اور اس سلسلے میں کام کرنے والے محققین اور سیاسی ٹیموں اور مختلف فرقوں کے علماء نے برسوں سوچ بچار کی ہے۔ اب تک جو سوال اُٹھے اور بحثیں ہوئیں اور پھر اُن سے جو نتائج نکلے اُن کی روشنی میں اگر دیکھا جائے تو یہ شرط پوری ہونا شاید ہی دائرہ امکان میں ہو کہ قانون صرف وہ جاری ہو جس پر حنفی اور اہلحدیث ہی نہیں، شیعہ برادران بھی متفق ہوں۔ چند مسائل کو تجربہ کے طور پر ان سارے مدارسِ فکر کے اکابر کے سامنے استفتا کے طور پر رکھیے اور دیکھیے کہ جوابوں میں کتنے بڑے فاصلے ہیں۔

۱۹۵۱ء میں جب تمام مدارسِ فکر کے جید و اکابر اور معتمد علیہ اور وسیع النظر علماء جمع ہوئے تھے تو انہوں نے اس بات پر سمجھوتہ کر لیا تھا کہ عام ملکی قوانین مسلم اکثریت کی فقہی تعبیرات کے مطابق بنیں گے، البتہ پرسنل لا کی حد تک کوئی بھی گروہ چاہے تو اپنی فقہ کے مطابق فیصلہ لے سکتا ہے۔

میرا خیال ہے کہ محترم جنرل صاحب اس خاص مسئلے پر ایک بار پھر غور کریں۔

(باقی بر صفحہ ۴۲)

محترم جنرل صاحب نے یہ بھی فرمایا کہ:-

"میری درخواست پر سعودی عرب کے شاہ خالد بن عبدالعزیز اور مصر کے صدر انورالسادات نے اپنے اپنے مذہبی امور کے مشیر بھیجنے کا وعدہ کیا ہے - اُن کے ساتھ ہی الجامعۃ الازہر کے شیخ بھی تشریف لا رہے ہیں اور وہ اسلامی قوانین مرتب کرنے میں ہماری مدد کریں گے"

اِس اقدام کی بہت سی برکات ہوسکتی ہیں، مگر جہاں تک قانون سازی یا عملی زندگی کے متعلق فقہی و مذہبی جزئیات کو طے کرنے کا تعلق ہے، زیادہ مفید کام وہی اہل علم کرسکتے ہیں جو ایک معاشرے کے مجموعی حالات، اس کے مخصوص مذہبی رجحانات، اس میں رائج شدہ صحیح اور غلط تصورات، یہاں کی عادات اور یہاں کے معروفات کو اچھی طرح جانتے ہوں - پھر اس کام میں یہ بھی ضروری ہوتا ہے کہ جو بھی قانون سازی کی جائے یا فقہی اُمور میں جو بھی فیصلے دیے جائیں اُن کو عوام کے سامنے اُن کی ذہنی کیفیات کو مدنظر رکھ کر اس طرح لایا جائے کہ وہ مطمئن ہوسکیں - یہ کام بھی یہیں کے علماء و عمائد زیادہ بہتر طور پر کرسکتے ہیں۔

ساتھ ہی یہ امر بھی ملحوظ رہے کہ اعلیٰ رُتبہ رکھنے والے باہر سے آئے ہوئے اکابرین کے لیے یہ تو ممکن نہیں کہ وہ قانون کے لمبے کام میں کچھ زیادہ وقت دے سکیں - اُن سے صرف اتنی ہی توقع کی جاسکتی ہے کہ وہ اسلامی کونسل یا اُس کی خاص کمیٹیوں کو اپنے مشورے دے سکیں -

خوش قسمتی سے عربی زبان میں الفقہ علی المذاہب الاربعہ شائع ہوچکی ہے جس میں ہر عنوان اور ہر مبحث سے متعلق چاروں فقہوں کی آرا یکجا دی ہوئی ہیں - اس سے پہلے بدایۃ المجتہد موجود تھی جس میں اختصار سے بتایا گیا ہے کہ مختلف مسائل میں نصوص کے کن اشارات اور دلالتوں کی بنا پر فقہائے اربعہ نے الگ الگ مسلک اختیار کیے۔ یہ کتاب ہر مسئلے میں اتفاق رائے کی حد کو بھی متعین کرتی ہے اور پھر اختلاف کے وجوہ کو بھی۔ علاوہ ازیں دورِ جدید میں اور بہت سی کوششیں ہوچکی ہیں - تازہ ترین کام الکویت میں ہو رہا ہے - جہاں فقہ اسلامی کا انسائیکلوپیڈیا تیار کیا جا رہا ہے اور اس کے بعض اجزا شائع ہوچکے ہیں -

اس طرح کا علمی سرمایہ اگر اسلامی کونسل کے سامنے ہو اور وہ تیز رفتار سے کام کرنے کا تہیہ کرلے تو ایسی کوئی مشکل نہیں ہے جو لاینحل ہو، یا جس کی وجہ سے اس ضروری کام کو مزید کئی برسوں

تک پھیلا دیا جائے۔

عوام میں اسلامی نظامِ قانون و عدالت کے لیے ایک طلب موجود ہے۔ اس طلب کے ہوتے ہوئے تدوین و نفاذ قانون کی منزل طے ہو جانی چاہیے، ورنہ اگر نادیدہ قانون کے دفتر تیار ہوتے رہے اور اس دوران میں سیکولر عناصر کی مداخلتوں سے عوام کی طلب ہی ٹھنڈی پڑ گئی تو پھر قانون کے دفتر کس کام آئیں گے۔

اپنی اسی طویل تقریر میں چیف مارشل لاء ایڈ منسٹریٹر جناب جنرل محمد ضیاء الحق نے یہ بھی فرمایا ہے کہ:

"مثلاً اگر تعلیمی نظام ہی کو اسلامی رنگ میں رنگنا چاہیں تو اس سلسلے میں محض قانون بنا دینا کافی نہیں ہوگا بلکہ نصابی کتابوں کی تیاری، اساتذہ کی تربیت، والدین اور ان کے بچوں کی تربیت اور رضا بھی لازمی ہے....."

ریڈیو سے تقریر کے یہ الفاظ سنتے ہی مجھے خیال آیا کہ کیا افغانستان میں نور محمد تہ کی کی حکومت نے بھی نظام تعلیم کے متعلق اسی طرح سوچا ہوگا، یا دیگر جن ممالک میں کمیونسٹ انقلاب لا کر معاشرے کے ہر شعبے میں تبدیلی لانا شروع کرتے ہیں تو کیا اُن کا نقشۂ کار ایسا ہی ہوتا ہے۔ کیا وہ یوں سوچتے ہیں کہ پہلے دو تین سال میں نصاب تیار کیا جائے پھر اساتذہ کی تربیت کا انتظام کیا جائے، پھر والدین اور اُن کے بچوں میں نئے نظامِ تعلیم کے متعلق رضامندی اور خواہش پیدا کی جائے؟

اصل میں انقلابی عزائم کے ساتھ جو لوگ سوچ سمجھ کر اور کام کا نقشہ بنا کر آگے آتے ہیں، وہ ہر دائرے میں تبدیلی کے پروگرام کو دو تین مراحل میں تقسیم کرتے ہیں۔ اوّلاً فوری اقدامات[1]، ثانیاً عبوری مرحلے کے لیے اسکیم اور ثالثاً مستقل معیاری لائحہ عمل۔

---

[1] فوری اقدامات ایسے ہوتے ہیں جن سے چند اہم علامتی تبدیلیاں برپا کر دی جائیں جو اچھی طرح محسوس ہوں اور جن کے ذریعے ہر کسی کو اندازہ ہو جائے کہ اب یہاں گاڑی فلاں سمت میں چلے گی۔

ورنہ اگر وہ تعلیم یا کسی دوسرے شعبے کے احوال کو تین چار سال کے لیے اس بنا پر یونہی چھوڑ دیں کہ پہلے ضروری تیاری کر لی جائیں، تو ان کا تختہ الٹ جائے۔

تبدیلی لانے والی حکومتیں یا قیادتیں ابتدائی مرحلے کے لیے یہ دیکھتی ہیں کہ مثلاً کیا کچھ نصابی مواد لکھا لکھایا مل سکتا ہے؟ کتنے استاد نئے نقشے پر کام کرنے کے اہل ہیں اور کتنے افراد دوسرے ذرائع سے اس شعبے میں لائے جا سکتے ہیں۔ پھر وہ موجودہ سروسامان کے بل پر کام شروع کر دیتے ہیں، اور آگے بڑھنے کے لیے مزید سروسامان کی فراہمی کی طرف متوجہ ہوتے ہیں۔

تبدیلی کا عمل پہلے دن ہی سے شروع ہو جاتا ہے۔ اور جہاں ایسا نہ ہو وہاں کوئی بھرپور اور نتیجہ خیز تبدیلی کبھی آ ہی نہیں سکتی۔

ہماری مملکت کو چلانے والی شخصیت کے ان الفاظ کو پڑھ کر یہ گمان ہوتا ہے کہ اُن کو اہم ترین مسائل میں مشورہ دینے والے لوگ بیوروکریسی کی سطح سے بلند تر نہیں ہیں۔ بیوروکریسی میں ایک بڑی کمی تخلیقی رجحان کی ہوتی ہے۔ وہ کسی تبدیلی کے لیے مشکل ہی سے ایسا مؤثر نقشہ تجویز کر سکتی ہے جس پر دینی و سیاسی اکابر بھی مطمئن ہوں، تعلیم (یا کسی دوسرے شعبے کے) کارپرداز بھی اس انقلابی عمل کی حکمت کو بخوبی سمجھ لیں جس کا آغاز ہو رہا ہے۔ اور عوام میں بھی نئی سمت سفر میں حرکت کرنے کا جذبہ جاگ اُٹھے۔

اُوپر کے الفاظ بیوروکریسی کے مخصوص ذہن کے آئینہ دار لگتے ہیں۔ کیونکہ بات ایسے انداز سے سامنے آتی ہے کہ اب اگر نظامِ تعلیم کی کسی تبدیلی میں برسوں کی مدت بھی لگ جائے تو یہ برحق ہوگا۔

مجھے یاد ہے کہ جب آزاد کشمیر میں سردار عبدالقیوم صاحب کی حکومت قائم ہوئی تھی تو انہوں نے مختلف اشخاص اور اداروں سے پوچھا کہ نظامِ تعلیم کو کس طرح تبدیل کیا جائے۔ یہ سوال مجھ تک بھی پہنچا۔ میں نے اس کے جواب میں بعض دوسرے اصحاب کے مشورے سے ایک مقالہ لکھا کہ موجودہ نظامِ تعلیم میں تبدیلی کیسے لائی جائے۔ اس میں میں نے فوری اور عبوری مرحلے کے لیے ایک لائحہ عمل دیا تھا، جس میں نصابیات اور اساتذہ جیسے بڑے مسائل کا حل بھی تجویز کیا گیا تھا۔

میری درخواست اپنی مملکت کے کارپرداز جناب محمد ضیاء الحق چیف مارشل لا ایڈمنسٹریٹر سے یہ ہے کہ اگر واقعی وہ اسلامی نظامِ تعلیم کو تبدیل کرنا چاہتے ہیں (اور بظاہر وہ صدق دلی سے ایسا

چاہتے ہیں) تو حالیہ تقریر کے محولہ بالا جملے سے وہ ذرا آگے بڑھیں، اور ایسا موقع باقی نہ رہنے دیں کہ مخالف یا غلط الفکر یا ناکارہ عناصر اس جملے کو اپنے تاخیری اور التوائی ذوق کی تسکین کا ذریعہ بنالیں۔ وہ اپنے ذاتی جذبۂ ایمانی اور اسلامی کونسل کے اراکین اور ملک کے دوسرے قابل اعتماد مفکرین کے مشوروں سے کام لے کر نظام تعلیم کے لیے فوری اور عبوری مرحلے کا پروگرام پہلے طے کریں اور اس کا اعلان بھی کریں۔ اور اس کے نفاذ کے لیے تیز رفتار عملی اقدامات کا آغاز کر دیں۔ وہ انقلابی لیڈروں کے مقام سے تبدیلی کی لہریں عملاً اٹھانے کی کوئی راہ نکالیں۔

ورنہ تاخیر پسند اور التوا پسند عناصر تو روز نئے نئے معقول بہانے تیار کر کر کے پیش کرتے رہیں گے۔ اور آپ کو عملاً ضروری اقدامات کا موقع نہ دیں گے۔

خدا کرے کہ آپ ایسے عناصر کے گھیرے میں کبھی نہ آئیں۔

اسلامی سزاؤں کے متعلق جو اصولی بات چیف مارشل لا ایڈمنسٹریٹر نے کہی ہے۔ میں بھی اسی کی تائید کرتے ہوئے اوپر کی ایک گذارش کو دوہراتا ہوں۔ وہ یہ ہے کہ اسلامی نظام چند منتشر اجزاء کا نام نہیں ہے۔ یہ تو ایک مشینری کی طرح سے مکمل چیز ہے اور سارے پرزے اپنی اپنی جگہ پر ہونے ہی سے یہ چلتی ہے۔

لیکن اس وقت جس طرح دیگر بہت سی سزائیں بغیر اسلامی حوالے کے رائج ہیں (اور بعض صورتوں میں پہلے بھی تازیانوں کی سزا دی جا رہی ہے) اگر چند سالوں سے بڑھتی ہوئی رفتارِ جرائم کو روکنے کے لیے کوڑوں کی سزا یا کوئی دوسری سزا حکومت نافذ کرے تو کونسی چیز اسے روک سکتی ہے کوڑوں کی سزا کو وہ بطور اسلامی حد کے جاری نہ کرے اور اسلامی حد کے لحاظ سے تو اب تک شرائط پوری ہو بھی نہیں رہیں۔

چوری اور خیانت کو روکنے کے لیے کسی دوسری سزا کے ساتھ اگر خیانت کردہ یا مسروقہ مال مجرم سے واپس لینے یا اس کی جائیداد سے وصول کرنے کا ضابطہ رائج کر دیا جائے تو خرابیٔ احوال میں کمی آسکتی ہے۔

چیف مارشل ایڈمنسٹریٹر کسی وقت سعودی عرب سے یہ دریافت کرائیں کہ وہ زمانہ جب بدو حاجیوں کے قافلوں کو لوٹتے تھے، کس طرح تبدیل ہو کر ان حالات تک پہنچا کہ کھلی پڑی چیزوں کو بھی کوئی ہاتھ نہیں لگاتا۔

پورا اسلامی نظام آنے سے پہلے بھی بہت سے کام کیے جا سکتے ہیں، جو اسلام کے نفاذ کے لیے راستہ ہموار کریں۔

محترم جنرل محمد ضیاء الحق نے اپنی تقریر میں ایک محدود صورت میں زکوٰۃ کا تجربہ کرنے کا اعلان بھی کیا ہے یعنی صاحبِ حیثیت لوگ رضاکارانہ طور پر زکوٰۃ دیں گے اور حکومت اس رقم کو منظم طور پر جمع کر کے اسلامی قوانین کے مطابق معاشرے کی بہبود کے لیے خرچ کرے گی۔ اس سلسلے میں غرباء، یتامیٰ، مساکین اور بیوائیں سرفہرست ہوں گی۔

خاصا قابلِ غور موضوع ہے۔

ایک بات تو یہ سامنے رہنی چاہیے کہ مملکتِ خداداد پاکستان میں ایک بار پہلے بھی رضاکارانہ جذبے سے زکوٰۃ دینے والوں کے لیے حکومت نے بنکوں میں زکوٰۃ فنڈ کا اجرا کیا تھا۔ مگر اس میں آمدنی اتنی برائے نام ہوئی کہ تجربہ ناکام ہو گیا۔

دوسری بات یہ ہے کہ اس کام کے لیے اگر کوئی محکمہ کھولا گیا تو محدود پیمانے پر آنے والی زکوٰۃ کا ایک بڑا حصہ سرکاری کارکنوں اور دفتروں پر خرچ ہو جائے گا۔

اسی طرح تیسرا معاملہ یہ اہم ہے کہ آخر کن طریقوں سے زکوٰۃ صحیح مستحقین تک پہنچے گی۔ آپ اگر اختیارات انتظامی افسروں کو دیں گے تو اکثر افسر اپنے آدمیوں کا خیال رکھیں گے اور سیاسی یا مذہبی لحاظ سے مخالف عناصر کو نظر انداز کریں گے۔ مثلاً اس وقت پیپلز پارٹی کے افسروں کی بڑی تعداد موجود ہے۔ ان میں سے بہت کم مذہب پسندی یا خدا خوفی کا رنگ رکھتے ہیں۔ کیا اُن سے بعید ہوگا کہ وہ زکوٰۃ کی تقسیم ایک خاص انداز سے کرائیں۔

آپ کہہ سکتے ہیں کہ پہلے سے فہرستیں تیار کرائی جا سکتی ہیں۔

سوال یہ ہے کہ فہرستیں کون تیار کرے گا؟ اگر افسران کریں گے تو بات وہی ہوئی۔ اگر آپ کہیں کہ ہماری یونین کونسلیں یا اصلاحی کمیٹیاں کریں گی تو پھر یہ سوال لازماً زیر غور آئے گا کہ ان کونسلوں اور کمیٹیوں کے ممبروں اور ان کی سابق خدمات کے متعلق لوگوں کی رائے کیا ہے۔ بہت سے مراسلات اس موضوع پر اخبارات میں شائع ہو چکے ہیں۔

اب اگر وصولیٔ زکوٰۃ یا تقسیم زکوٰۃ میں ایک مرتبہ مختلف مقامات پر غلط مثالیں سامنے آگئیں تو پھر لوگوں میں ادارۂ حکومت پر یہ اعتماد نہیں رہ سکے گا کہ اس کے ذریعے زکوٰۃ صحیح جگہوں تک پہنچائی جا سکتی ہے۔ خیال رہے کہ پہلے بھی یہ اعتماد موجود نہیں تھا۔

زکوٰۃ کا تجربہ شروع کرتے ہوئے ہزار بار سوچیے کہ فی الوقت اسے محض اہل ثروت کے رضاکارانہ جذبات پر دار و مدار رکھتے ہوئے ہاتھ میں لینا چاہیے یا نہیں۔

اس طرح کے نکات بہت سے ہیں۔ اِن اوراق میں سب پر گفتگو کرنا ممکن نہیں۔ میں جناب مارشل لا ایڈمنسٹریٹر کے اس خوش آئند جملے کو درج کرتے ہوئے قلم روک رہا ہوں کہ:

"اسلام ایک نہایت مہذب، نرم مزاج اور معتدل دین ہے۔ اس کے رفاہی پہلو اس کے تعزیری پہلوؤں سے کہیں زیادہ ہیں۔"